© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

فوجوں کی نقل و حرکت، منظم جماعتوں کی سرگرمیاں اور بڑے بڑے اداروں کے کام دیکھ کر عموماً لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ اصل چیز جماعتی تنظیم ہے، افراد چاہے جیسے بھی ہوں، تنظیم اگر مکمل اور مستحکم ہے تو کامیابی اس کے قدم چوم کر رہتی ہے۔ اسی طرح اجتماعی نظامات کی قیل و قال اور مختلف اجتماعی فلسفوں کی کاغذی بحثیں سن کر اور پڑھ کر بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ اجتماعی نظام ہی سب کچھ ہے، وہ اگر صحیح اور منصفانہ ہو اور پُرزور جد و جہد سے قائم کر دیا جائے تو انسانیت کی فلاح یقینی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تنظیم تنظیم کا شور برپا ہے اور دوسری طرف اجتماعی نظاموں پر سرگرم علمی و نظری بحثیں ہو رہی ہیں۔ گویا ایک اچھی منظم جماعت کا وجود میں آجانا اور ایک مکمل اجتماعی نظام، اس کی صحت اور اس کے بقاء و استحکام کا سارا انحصار اُن افراد کی سیرت و کردار پر ہوتا ہے جو اس ظاہری عمارت کے اندر اینٹوں کی طرح جوڑے جاتے ہیں۔ اگرچہ ضبط و نظم کے قاعدے اور اجتماع کے اصول بھی اپنے اندر بہت کچھ اہمیت رکھتے ہیں لیکن سیلاب حوادث کا اصل مقابلہ اور عملی زندگی کی آزمائشوں کا حقیقی سابقہ قاعدوں اور اُصولوں سے نہیں بلکہ ان کو چلانے والے افراد سے پیش آتا ہے۔ دنیا کی امتحان گاہ میں ضابطے اور اصول نہیں اُترتے، افراد اُترتے ہیں اور انہی کی طاقت وہ آخری طاقت ہوتی ہے جس پر امتحان کے فیصلے کا مدار ہوتا ہے۔ جماعتی ضبط خواہ کتنا ہی مکمل ہو اور اجتماع کے اصول چاہے کتنے ہی صحیح ہوں، لیکن اگر انفرادی سیرتیں عمدہ اور پختہ نہ ہوں تو نہ ضابطے اور قاعدے کسی کام آتے ہیں نہ اصول۔ زمانے کا طوفان بند کی ایک ایک اینٹ کو آزماتا ہے اور جہاں چند کمزور اینٹیں اُسے مل جاتی ہیں وہیں سے رخنہ پیدا کر کے اپنا راستہ نکال لیتا ہے، پھر نہ انجینیری کے وہ اصول کچھ بنا سکتے ہیں جن سے بند کی تعمیر میں کام لیا گیا ہو اور نہ وہ بندشیں ہی سیلاب کا منہ پھیر سکتی ہیں جن سے اینٹوں کو جوڑا گیا ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس وقت دنیا میں بڑی بڑی قوموں کے درمیان جو عظیم الشان تصادم برپا ہے اس میں اصلی فیصلہ کن طاقت افراد کی طاقت ہے نہ کہ تمدنی اصولوں کی طاقت یا فوجوں اور پارٹیوں کے ڈسپلن کی طاقت۔ یہ لڑائی کشمکش کرنے والی قوموں کے ایک ایک فرد کی قوتِ تحمل کا امتحان لے رہی ہے۔ ایک ایک قوم کو تپا تپا کر دیکھ رہی ہے کہ اس کے افراد میں کتنا صبر ہے، مصیبتوں اور صدموں کی کتنی برداشت ہے، نقصان اٹھانے کا کتنا حوصلہ ہے، خواہشاتِ نفس پر کتنا قابو ہے، شخصی مفاد کو قربان کرنے کی کتنی طاقت ہے، جماعتی یا قومی نصب العین کا کتنا عشق ہے اور پروانہ وار اس پر فدا ہو جانے اور اپنا سب کچھ فدا کر دینے کی کتنی جرأت ہے۔ اس آزمائش میں جن قوموں کے افراد بودے ثابت ہوئے وہ گر چکی ہیں، جن کی طاقت آگے چل کر جواب دے جائے گی وہ شکست کھا جائیں گی، اور جن کے افراد کی سیرت سب سے زیادہ مضبوط ثابت ہوگی وہی آخرکار فتح یاب نکلیں گی۔ فرانس کے سب سے پہلے گر جانے کا سبب اس کے سوا کیا تھا کہ وہاں انفرادی اخلاق کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ حال میں اٹلی کے قومی وقار کو کس چیز نے پامال کرا دیا؟ کیا وہ اس کے سوا کچھ تھی کہ اطالویوں کی انفرادی سیرتیں اپنے حریفوں کے مقابلہ میں کمزور نکلیں؟ حتیٰ کہ فاشیت کی تنظیم اور جرمنوں کی پشت پناہی بھی اس کمزوری کی تلافی کرنے سے عاجز ہو گئی۔ جرمنی اور انگلستان نے ایک دوسرے پر جو ہولناک ہوائی حملے کیے اور بحری معاذوں میں دونوں نے ایک دوسرے کو جو زبردست نقصانات پہنچائے ان کے مقابلہ میں کیا محض تنظیم اور تمدنی اصولوں کے بل بوتے پر یہ قومیں ٹھیر سکتی تھیں؟ اگر ان میں سے کسی ایک کے افراد کی اخلاقی طاقت بھی جواب دے جاتی تو یہ کاری ضربیں سہہ جانا اس کے لیے قطعی محال تھا۔ جرمنی اور روس کی جنگ میں لوہے اور آگ کا کھیل جس طرح کھیلا گیا ہے، جس سے زیادہ خوفناک کھیل چشمِ فلک نے آج تک نہیں دیکھا، کیا یہ کھیل محض نازیت اور اشتراکیت کے اصولوں کی طاقت سے کھیلا جا سکتا تھا؟ اگر دونوں قوموں کے افراد اس کے لیے کافی اخلاقی طاقت نہ رکھتے ہوتے تو جنگ کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز معاملہ چین کا ہے۔ جاپان کی تنظیم، اس کی تمدنی ترقی، اس کے وسائل اور اس کی صنعتوں کے مقابلہ میں چین کچھ بھی نہیں رکھتا۔ لیکن یہ چینیوں کا عزم اور ان کا صبر و تحمل، اور اپنے قومی نصب العین کے ساتھ ان کا عشق ہے جس کی بدولت وہ ناقابلِ بیان نقصانات اٹھانے کے باوجود سات سال سے جاپان کے مقابلہ میں جمے ہوئے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ تو وہ حقیقتیں ہیں جو بالکل سرسری نظر سے آج ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ لیکن اگر زیادہ گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کوئی جماعتی ضبط اور کوئی اجتماعی نظام اس وقت تک چل ہی نہیں سکتا جب تک کہ افراد میں اس کے لیے سچی وفاداری موجود نہ ہو اور ان کے اندر وہ اخلاقی صفات نہ پائی جائیں جو اس کی فطرت سے مناسبت رکھتی ہوں۔ ایک بہتر سے بہتر نظام بھی ناکام ہو جاتا ہے اگر اس کو چلانے والے افراد کی سیرتیں کمزور ہوں اور ایک غلط سے غلط نظام بھی کامیابی کے ساتھ چل جاتا ہے اگر اس کو چلانے کے لیے مضبوط سیرت کے افراد بہم پہنچ جائیں۔ انفرادی کمزوریاں ہی وہ رخنے پیدا کرتی ہیں جن سے بالآخر مستحکم سے مستحکم اجتماعی نظام ٹوٹ جاتے ہیں۔ افراد کی اخلاقی طاقت نظام کے رخنوں کو بھر سکتی ہے۔ مگر انفرادی سیرت کے رخنوں کو بھرنا نظام کے بس کا کام نہیں ہے۔ برطانیہ کے جمہوری نظام سے زیادہ ناقص نظام کا شاید تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے دستور میں اتنے شگاف ہیں اور اتنے بڑے بڑے شگاف ہیں کہ ان سے شخصی استبداد کا طوفان ہر وقت پھوٹ نکلنا ممکن ہے۔ لیکن جس چیز کی بدولت مدتہائے دراز سے پارلیمنٹری نظام حکومت اس ملک میں چل رہا ہے وہ صرف یہ ہے کہ انگریزی قوم کی سیرت اس کی پشت پناہ بنی ہوئی ہے۔ اسی لیے شگافوں، اور بڑے بڑے شگافوں کی موجودگی میں بھی کوئی طوفان ان سے سر نہیں نکال سکتا۔ اس نظام کی تقلید بہت سے ملکوں نے کرنی چاہی اور انھوں نے کاغذ پر ان شگافوں کو بھر دیا جو برطانوی دستور میں ان کو نظر آئے مگر کہیں بھی یہ کامیابی کے ساتھ نہ چل سکا، ہر جگہ انفرادی سیرت کی کمزوریاں اس طوفان کو لے آئیں جس کا دروازہ کاغذی رخنہ بندیوں سے بند کیا گیا تھا۔ اس مثال پر ماضی اور حال کی تاریخ سے بہت سی اور مثالوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جماعتی ضبط اور اجتماعی نظام کا استحکام بجائے خود انفرادی سیرت کے استحکام پر منحصر ہے۔

دنیا میں جو نظام بھی قائم ہوئے اور کامیابی کے ساتھ چلے ہیں ان میں سے کسی نے بھی محض اس چیز پر اکتفا نہیں کیا ہے کہ افراد میں جماعتی ضبط قائم کریں اور پھر اپنے پسند کردہ اجتماعی نظام کو قوت قاہرہ کے ذریعہ سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زمین پر مسلط کر دیں۔ بظاہر اُنکے کاموں میں یہی چیزیں نمایاں نظر آتی ہیں، اس لیے لوگ اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ ان کی کامیابیوں کا سارا دارومدار محض پارٹیوں اور فوجوں کے ڈسپلن، سیاسی و معاشی اداروں کی تنظیم اور ایک مضبوط بیوروکریسی کے قیام پر ہے۔ حالانکہ دراصل یہ سارے نظام افراد میں اپنے مناسب حال اخلاق پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں اور ان کی کامیابی بالکل اس پر منحصر ہے کہ انھیں مسلسل ایسے افراد کی رسد بہم پہنچتی رہے جن کے اخلاق اور جن کی سیرتیں ان نظاموں کے مناسب حال ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا تصورِ اخلاق ہمارے تصور سے بالکل مختلف ہو اور ہماری نگاہ میں وہ چیزیں عین بداخلاقی قرار پائیں جو ان کے نزدیک کمال اخلاق ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں کہ جو اخلاقیات ان نظاموں کو اپنے بقا و استمرار اور اپنی ترقی و استحکام کے لیے واقعی مطلوب ہیں ان کی تربیت اپنے افراد کو دینے میں یہ کمال درجہ کی سعی کر رہے ہیں اور موجودہ جنگ ایک پیمانہ ہے جس سے ناپ کر برای العین دیکھا جا سکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اس تربیت میں کتنی سعی کی ہے۔ انھیں دنیا میں جو کام کرنا ہے اس کے لیے پاکیزگی و طہارت کی فی الواقع کوئی ضرورت نہیں ہے، اُس کے لیے عفت، راستبازی، رحم، انصاف، خداترسی اور شرافتِ نفس سرے سے مطلوب ہی نہیں ہیں، اس لیے یہ صفات ان کی اخلاقی تربیت میں کوئی مقام نہیں رکھتیں۔ اسی طرح جن قبائح و شنائع سے اُن کے پیشِ نظر کام میں کوئی قباحت واقع نہیں ہوتی ان سے اپنے افراد کے نفوس کا تزکیہ کرنے کی بھی وہ کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ان کے نظام میں ایک پرلے درجے کا جھوٹا، زانی، شرابی، جواری اور ہمارے نقطۂ نظر سے انتہائی بدکردار آدمی بھی کھپ سکتا ہے کیونکہ ان عیوب کی وجہ سے اس میں کوئی رخنہ نہیں پڑتا۔ مگر جو صفات انھیں مطلوب ہیں وہ انھوں نے ایک دو افراد میں نہیں، کروڑوں کی آبادیوں میں اس کمال کے ساتھ پیدا کی ہیں، اور جن صفات سے ان کے کام میں خرابی واقع ہوتی ہے اُن سے دس پانچ کا نہیں کروڑوں انسانوں کا ایسا مکمل تزکیہ کر دیا ہے کہ بڑے سے بڑے شیوخِ طریقت کو بھی ان پر رشک کرنا چاہیے۔

آج جو قومیں لڑ رہی ہیں ان کی جیب سے کروڑہا کروڑ روپیہ روزانہ نکل رہا ہے اور صریحاً آگ میں جھونکا جا رہا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ انھوں نے اپنے بے شمار افراد میں انفاق مال کا جذبہ پیدا کر دیا ہے؟ ان کے چھوٹے بڑے، ادنیٰ اور اعلیٰ سب نہایت درجہ کی جفاکشی کے ساتھ اس مقصد کی خدمت کر رہے ہیں جسے وہ عزیز رکھتے ہیں اور اس راہ میں ہر قسم کی محرومیاں، نہ صرف اسبابِ عیش سے بلکہ ضروریاتِ زندگی تک سے محرومیاں انھوں نے گوارا کرلی ہیں۔ کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ پورے پورے ملکوں کی آبادیوں کو ایثار و محنت و مشقت، اور حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لینے اور اپنے نفس پر قابو پالینے کی پوری تربیت دے چکے ہیں؟ ان کے شہر کے شہر گولہ باریوں میں تباہ ہو رہے ہیں، ساری ساری عمر کی کمائیاں آن کی آن میں غارت ہو رہی ہیں، ہزاروں آدمی ایک ایک ہوائی حملے میں بے خان ماں ہو رہے ہیں، دکانیں، کارخانے، مکان، گودام سب ہی کچھ جل رہے ہیں، روز روز کے ہوائی حملوں نے ان کی زندگی کو اطمینان سے قطعی محروم کر رکھا ہے، مگر ان کے عزم میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا نہ غنیم کے آگے جھک کر صلح کر لینے کی خواہش ان میں پیدا ہوتی ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انھوں نے اپنے بچہ بچہ میں صبر، استقلال، تحمل، اور پختگیِ ارادہ کی صفات پیدا کر دی ہیں؟ وہ آئے دن شکستوں کی خبریں سنتے ہیں، جہازوں کے ڈوبنے اور بڑے بڑے علاقے ہاتھ سے نکل جانے کی خبریں سنتے ہیں۔ بڑی بڑی فوجوں کی چڑھائیوں اور دشمن کی ہولناک تیاریوں کی خبریں سنتے ہیں، مگر ان کی ذرا ہمت نہیں ٹوٹتی، بلکہ اپنے مقصد پر ان کا ایمان کچھ اور بڑھ جاتا ہے، سمندِ عزم کو ایک اور تازیانہ لگ جاتا ہے۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ ان کی اخلاقی تربیت نے پوری پوری قوم کو اولو العزم اور بلند حوصلہ بنا دیا ہے؟ ان میں لاکھوں مائیں ہیں جو اپنے عزیز بچوں کو اور لاکھوں بیویاں ہیں جو اپنے محبوب شوہروں کو خود جنگ کی آگ میں جھونک رہی ہیں اور لاکھوں نوجوان ہیں جو جانتے بوجھتے اُن ہوائی، بحری اور بری لڑائیوں میں جا رہے ہیں جن سے زندہ بچ کر آنے کی کم ہی اُمید ہوتی ہے۔ باوجودیکہ وہ موت کے بعد کسی اور زندگی کے بھی قائل نہیں، مگر پھر بھی وہ اُس راہ میں جان دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں جس کی کامیابیوں کے پھل ان کو نہیں بلکہ دوسروں کو کھانے ہیں۔ کیا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کی تربیت نے کروڑوں افراد میں قربانی، شجاعت اور جاں بازی کے اوصاف پیدا کر دیے ہیں؟ پھر ان ایجابی صفات کے مقابلہ میں انھوں نے خود غرضی، شحِ نفس، نفاق، غداری، قومی خیانت، جبن و بزدلی، اور ایسی ہی دوسری غیر مطلوب صفات سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پوری پوری قوموں کے نفوس کا جیسا کچھ تزکیہ کیا ہے وہ ظاہر ہے۔

اگر افراد کی تیاری سے یہ نظام غافل ہوتے اور صرف جماعتوں اور فوجوں کے ڈسپلن اور اجتماعی اداروں کی تنظیم پر قناعت کر لیتے تو کس طرح ممکن تھا کہ جنگ کی اس مصیبت میں جس کی سختیاں ایک ایک فرد تک پہنچ رہی ہیں، یہ قومیں اتنی پامردی دکھاتیں۔

یہاں ان قوموں کی نظیریں پیش کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ ہم ان کو اپنے لیے مثال بنانا چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں، وہ اس سے بہت فروتر ہیں کہ ہم انھیں مثال قرار دیں، اور انسانیت کبریٰ کے نقطۂ نظر سے ان کے اخلاقیات اتنے ناقص ہیں کہ کوئی مسلمان انھیں مثال قرار دینے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ مگر یہاں ان نظائر کو ہم نے صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ جو لوگ انہی قوموں کو دیکھ کر تنظیم، تنظیم پکارتے ہیں اور ان کے لٹریچر سے متأثر ہو کر اجتماعی فلسفوں پر اپنی تمام توجہات کو مرکوز کر دیتے ہیں انھیں معلوم ہو جائے کہ جن کی مثال سے انھوں نے یہ سبق سیکھے ہیں ان کے ہاں بھی محض تنظیم اور اجتماعی ادارے ہی سب کچھ نہیں ہیں بلکہ اصل چیز انفرادی سیرت ہے جس کی چٹان پر سارے نظامات قائم ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ضمناً ہم یہ بات بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ جن قوموں نے نظامِ فاسد کا علم بلند کر رکھا ہے اور جن کے مقابلہ میں جدوجہد کر کے ہمیں نظامِ صالح قائم کرنا ہے، ان کی اخلاقی قوتوں کا کیا حال ہے۔

اگرچہ اسلامی نقطۂ نظر سے مقصود بالذات اجتماعی نظام نہیں بلکہ فرد کی تکمیل ذات ہے، اور اجتماعی نظام اسی کے لیے مطلوب ہے، نیز خدا کے سامنے ایک ایک انسان فرداً فرداً جوابدہ ہے اور اس جوابدہی کے لیے انفرادی سیرت و کردار کی اصلاح بجائے خود ناگزیر ہے۔ لیکن اس بحث کو اگر تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز کر دیا جائے اور محض ایک صالح نظام کے قیام ہی کو مقصد کی حیثیت سے پیشِ نظر رکھا جائے تب بھی یہ ماننا پڑے گا کہ جماعتی انضباط اور منظم حرکت اور اقامتِ نظامِ صالح کی جدوجہد پر افراد کا تزکیۂ نفس اور مکارمِ اخلاق کی تربیت بہرحال مقدم ہے۔ اس کے بغیر کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ کمزور سیرتوں کے افراد کو لے کر کوئی پیش قدمی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ کچی اینٹوں سے ایک ایسا بند

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعبیر کیا جائے جس کو حوادث کا سیلاب پہلی ہی ٹکر میں پاش پاش کر کے رکھ دے۔

اپنے مقصد کے لیے انفرادی سیرت و اخلاق کی جو تیاری ہمیں مطلوب ہے اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ہمیں تین پہلوؤں سے اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔

(۱) وہ کیا اخلاقی صفات ہیں جو کسی اجتماعی نظام کو قائم کرنے اور مخالف طاقتوں کے مقابلہ میں کامیاب جدوجہد کرنے کے لیے بہرحال ضروری ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی سا اجتماعی نظام ہو۔

(۲) وہ کونسی اخلاقی صفات ہیں جو فاسد نظامات کو مٹا کر ایک صالح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

(۳) وہ کیا تدابیر ہیں جن سے یہ دونوں قسم کی صفات وسیع پیمانہ پر ایک پوری قوم میں پیدا کی جاسکتی ہیں۔

پہلے دو مسئلوں کے متعلق ہمیں قرآن و حدیث کی تعلیمات کا پورا جائزہ لینا ہوگا تاکہ ہم ان تمام مطلوبہ صفات کا منبع خود اللہ اور اس کے رسول کی ہدایات میں تلاش کر سکیں اور ہمیں یہ معلوم ہو کہ جس خاص نوعیت کا نظام ہم قائم کرنا چاہتے ہیں اس کی فطرت سے کونسی صفات مناسبت رکھتی ہیں جن سے نفوس کا آراستہ ہونا ضروری ہے، اور کونسی صفات اس سے مناسبت نہیں رکھتیں جن سے نفوس کا تزکیہ ناگزیر ہے۔ رہا آخری مسئلہ تو اس میں ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کار سے ہدایت حاصل کرنی ہے۔ جس طرح آپ نے پہلے اپنی تمام قوت ایک قوم کو نظام صالح کا علمبردار بنانے پر صرف کی اور اسے اتنا تیار کر دیا کہ وہ تمام دنیا کے فاسد نظامات کو مٹا کر نظام صالح قائم کرنے کے لیے سربکف میدان میں آکھڑی ہوئی اسی طرح آج ہم بھی اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکتے جب تک ایک قوم کو مجموعی حیثیت سے اتنا تیار نہ کر لیں کہ وہ اس مقصد کی راہ میں تن من دھن سے جدوجہد کرنے اور اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ جن قوموں کے مقابلہ میں ہمیں نظام صالح قائم کرنا ہے ان میں سے ہر ایک نے اپنے نظام فاسد کی محبت میں فنائیت کا مقام حاصل کر لیا ہے اور جو کچھ وہ ان نظاموں کے لیے کر رہی ہیں وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اب اگر ہم کمیت اور کیفیت، دونوں میں ان سے زیادہ اعلیٰ درجہ کی اخلاقی صفات ان سے زیادہ وسیع پیمانہ پر اور ان سے زیادہ گہری بنیادوں پر ایک بڑے حصۂ آبادی میں پیدا نہ کریں تو ہمارا ان کے مقابلہ میں کامیاب ہونا محال ہے۔

© rasailojaraid.com